جھیل

نئی نئی نوکری لگی تھی۔ گھر کی ذمہ داریاں والد صاحب کے تواناں کندھوں پر تھی تو ساری تنخواہ میری ہی جیب میں گم ہو جاتی تھی۔ اپنی کمائی سوچ کے زاویے بدل دیتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار محسوس کرنے لگتا ہے، آرزوئیں بے لگام ہو جاتی ہیں اور خواہشات کے نت نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔ میں نے اپنی اس خود مختاری کی پہلی عید سوات کے شہر کالام میں گزارنے کی ٹھانی۔ چھٹیاں آتے ہی میں اور میرا دوست کاشف راولپنڈی کے بس سٹیشن سے کالام کے لئے روانہ ہو گئے۔

سوات قدرتی کرشموں اور ٹھنڈے میٹھے لوگوں کا مسکن ہے۔ سیاحوں کے لیے تو یہ جنت نظیر ہے۔ لیکن وہاں بسنے والی آبادی کو اس کے سب رنگ دیکھنا پڑتے ہیں۔ سردیوں میں جب برف پڑتی ہے تو سب برف کی تہہ کے نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی زیادہ تر تعداد اس موسم میں میدانی علاقوں کا رخ کرتی ہے۔ بہار کے آتے ہی برف کی چادر پگھلنے لگتی ہے اور زندگی لوٹنے لگتی ہے۔ گرمیوں میں سوات کی وادی فردوسِ بریں بن جاتی ہے اور ملک اور بیرون ملک سے سیاحوں کے جتھے کے جتھے

اس وادی کا رخ کرتے ہیں۔موسم کی شدت کی وجہ سے یہاں کے لوگ توانا اور محنت کش ہوتے ہیں۔سوات کی مقامی آبادی مہمان نواز اور اپنی روایتوں سے مضبوطی سے جڑی ہے۔روایات پر سمجھوتہ نہیں ہوتا۔اس وادی کے باسی ہمیشہ ہی آپ کو خوش آمدید کہیں گے کیونکہ سیاحت ان کا سب سے بڑا وسیلہ روزگار ہے۔البتہ آپ کو مقامی لباس کے تقاضے،لوگوں کی چادر اور چار دیواری کا تقدس اور خواتین سے جڑی روایات کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔

ہمارا پہلا سٹاپ مینگورہ تھا۔ مینگورہ سوات کا پہلا بڑا شہر ہے۔ مینگورہ سے بحرین کے سفر میں کہیں کہیں قدرتی حسن کی جھلک اور آنے والی جنت کی نشانیاں ملتی ہیں۔بحرین پہنچتے ہی سوات کی پہچان دریائے سوات پہلی بار اپنے پورے جوبن پر نظر آتا ہے۔اس جگہ یہ نہ تو بہت گہرا ہے اور نہ ہی چوڑا۔لیکن اس کی رفتار ہے کہ کسی طوفان کا پتا دیتی ہے۔یخ بستہ برفانی تودوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے نکلتا یہ دریا اپنے بطن میں رکھے پتھروں سے اس قدر والہانہ انداز سے ملتا ہے کہ پانی کی پھنوار سفید جھاگ میں بدل جاتی ہے۔ یہ جھاگ تیزی سے بہتے شفاف پانی کو کچھ اس طرح نظروں سے اوجھل کرتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے دودھ کی نہر بہہ رہی ہو۔ بحرین میں دریا کے کنارے بہت سے ہوٹل اور ریسٹورنٹ ہیں۔بپھرے دریا کے کنارے بیٹھ کر لذیذ کباب کھانے کا مزہ تو ہے ہی لیکن دریا سے اٹھتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں گرما گرم چائے کی چسکیاں لینے کی بات ہی کچھ اور ہے۔بحرین سے کالام کے سفر میں آپ کو سرسبز پہاڑ،کسی شرارتی بچے کی مانند کبھی دائیں تو کبھی بائیں

سے نمودار ہوتا دریا، آسمان کی بلندیوں کو چھوتے گھنے درختوں کے جنگل اور پرشکوہ وادیاں ملتی ہیں۔

کالام ایک چھوٹا سا شہر ہے اور سوات میں سیاحت کا مرکز۔ جیب کی طاقت کی مناسبت سے ہر قسم کے ہوٹل موجود ہیں۔ کھانے کا بھی اچھا انتظام ہے۔ روایتی ملبوسات، سواتی ٹوپی اور ثقافتی تحائف کی دکانیں جا بجا موجود ہیں۔ ابھی شام کے دھندلکے گہرے نہ ہوئے تھے کہ ہم کالام کے بس سٹیشن پر پہنچے۔ سفر طویل تھا اور کچھ موسم کا بھی جادو تھا، آنکھوں میں نیند بھر گئی۔ رستہ پوچھ اپنے ہوٹل پہنچے۔ فریش ہوئے، کھانا کھایا اور سو گئے۔

صبح دریا کے شور سے آنکھ کھلی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو مہکتی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا، روح تک تازہ ہوگئی۔ بالکل سامنے دریائے سوات ٹھاٹھیں مارتا بہہ رہا تھا۔ اس کے عین عقب میں بلند و بالا سرسبز پہاڑ جیسے اس کی نگرانی پر معمور تھے۔ ان پہاڑوں پر موتیوں کی طرح بکھرے خودرو پھولوں کے انبار اور صدیوں کی داستانیں لیے پرشکوہ درخت۔ پھر ان سے بھی پرے چڑھتے سورج کی کرنوں کی بسنت اور دلفریب ہوا کے جھونکے۔

پہاڑ کے ساتھ انسان کا عجیب رشتہ ہے۔ کوئی تو اس کی چوٹی سر کرنے کی دھن میں زندگی بتا دیتا ہے تو کوئی اس کو تراش کر گھر آباد کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ کسی کو یہ طوفان نوح سے بچنے کا وسیلہ نظر آتا ہے تو کوئی عشق مجازی کے حصول کے لیے اس کا

سینہ پھاڑ کر نہر نکالتا ہے۔ کبھی کسی پہاڑ کی آغوش میں اصحابِ کہف صدیوں کی نیند سوتے ہیں تو کبھی دو پہاڑوں کے بیچ کسی کا بے بسی سے سعی کرنا حج کا رکن ٹھہرتا ہے۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر خدا موسیٰ سے ہم کلام ہوتا ہے اور کسی پہاڑ کی غار میں جبریلِ امین محمدؐ کے پاس وحی لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ پہاڑ سے انسان کا رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان کا انسان سے۔

ان پہاڑوں کے دامن میں بکھرے پتھر نہ جانے کب سے یہاں ہیں۔ شاید صدیوں سے یا اس سے بھی پہلے۔ سب فانی ہے یہاں تک کہ یہ پتھر بھی۔ ہوا کی آری ہو یا پانی کی کدال، قطرہ قطرہ ٹپ ٹپ کرتی بارش کی دستک ہو، یا گرم سرد کی تکرار، پتھر کو ایک دن ٹوٹ جانا ہوتا ہے۔ ہاں انسانوں کی نسبت اس کی زندگی بہت لمبی ہوتی ہے اس لیے انسان اس سے مرعوب ہو جاتا ہے۔ کبھی بت تراشتا ہے، کبھی اوزار بناتا ہے، آگ پیدا کرتا ہے یا مسکن تخلیق کرتا ہے اور کبھی کبھی اس سے ہابیل کی جان بھی لے لیتا ہے۔

قصہ مختصر، ناشتے سے فارغ ہو کر ہوٹل کے مینجر سے مقامی سیاحتی مقامات کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ زیادہ تر سیاح مہوڈنڈ جاتے ہیں۔ مہوڈنڈ پشتو زبان کا لفظ ہے جس میں مہو کے معنی مچھلی اور ڈنڈ کے معنی وہ جگہ ہے جہاں پانی اکٹھا ہو۔ سڑک جھیل تک جاتی ہے اور سواری کا بھی مناسب انتظام موجود ہے۔ پیدل بھی جا سکتے ہیں۔ راستہ بہت دلفریب ہے لیکن فاصلہ زیادہ ہے۔ وہاں گھڑ سواری

کے لئے گھوڑے کرائے پر دستیاب ہیں۔اس کے علاوہ بچوں کے لئے جھولے اور جھیل کی سیر کے لئے موٹر بوٹ بھی ہے۔جھیل ایک جزیرے کے گرد دائرے کی صورت میں ہے۔اس کا نیلا تریاق جیسا پانی اس قدر خوشنما ہے کہ آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ہاں،اس کی سب سے مشہور سوغات اس جھیل میں لہروں کے مخالف تیرتی ہوئی ٹراؤٹ مچھلی ہے۔مقامی لوگوں نے اس کے شکار کا انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ ایک لمبی سی لکڑی کے ایک سرے کو تراش کر ایک نیزہ سا بنا لیتے ہیں۔پانی اس قدر شفاف ہے کہ جب کوئی مچھلی کنارے کے قریب آتی ہے تو صاف نظر آتی ہے اور وہ اپنے نیزے سے اُس مچھلی کو اچک لیتے ہیں۔آپ مچھلی خریدیں اور ساتھ ہی موجود کاریگروں سے صفائی کروا کر یا تو کوئلوں پر بھنوالیں یا تیل میں تلوالیں۔اتنی عمدہ اور تازہ مچھلی آپ کو اور کہیں نہیں ملے گی۔بہت مشہور جگہ ہے۔

میں نے استفسار کیا کہ کیا کوئی اور جھیل بھی ہے تو کہنے لگا ہاں ہے،کنڈول ڈنڈ۔لیکن اس تک کوئی سڑک نہیں جاتی اور راستہ بھی کٹھن ہے۔لوگ اکثر راستہ بھول جاتے ہیں۔جھیل بہت خوبصورت ہے اور سیاحتی مقام نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک ابھی قدرتی معصومیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔کنڈول بھی پشتو زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی بڑے پیالے یا جام کے ہیں۔اس جھیل تک جانے کے دو راستے ہیں۔ آپ جیپ بھی بُک کروا سکتے ہیں اور اپنی گاڑی پر بھی جا سکتے ہیں۔کالام سے پہلے

اتر وڑ جانا پڑتا ہے اور وہاں سے لدواس سے آگے گاڑی نہیں جاتی۔کوئی دو گھنٹے کی پیدل مسافت ہے اور رستہ بھی زیادہ دشوار نہیں۔کنڈول ڈنڈ کالام سے کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہو گی۔ دوسرا راستہ پہاڑوں سے گزر کر جاتا ہے۔لیکن اس راستے پر کوئی سڑک نہیں۔مختصر ہے لیکن کٹھن ہے۔

میں نے اور کاشف نے فیصلہ کیا کہ مہوڈنڈ تو کبھی بھی جا سکتے ہیں، اپنے سفر کا آغاز کنڈول جھیل سے کیا جائے۔مینجر کے مشورے سے ایک گائیڈ بھی ساتھ لے لیا جس کے پاس اپنا لائسنس والا ہتھیار تھا اور اس نے ایک کندھے پر ذنبیل نما ایک تھیلا بھی اٹھا رکھا تھا۔ابھی ہوٹل سے نکلنے کو ہی تھے کہ لاہور سے آئے چار لڑکوں کے گروپ نے بھی ہمارے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ہم نے بھی سوچا کہ نامعلوم منزل کا قصد ہے۔زیادہ لوگ ہی بہتر ہوں گے۔تو ہم چھ اپنے گائیڈ کی رہنمائی میں ایک پتھریلے راستے پر چل دیئے۔زندگی کے سفر میں بھی زیادہ تر منزل کو جاتی کشادہ سڑکیں نہیں ہوتیں بلکہ پگڈنڈیاں اور پتھریلے راستے ہوتے ہیں۔ بھٹک جانے یا غلط راہ چننے کے امکانات ہمیشہ ہی روشن ہوتے ہیں۔ایسے میں کسی راہبر کا ہونا بہت ضروری ہے۔لوگ منزل کو بالآخر پہنچ ہی جاتے ہیں راہبر کے بغیر بھی لیکن ٹھوکریں کھانے کے بعد۔خیر اس مہم جوئی کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔وہاں کوئی سڑک نہیں جاتی، اس کا مطلب ہمیں آہستہ آہستہ سمجھ آنے لگا۔راستہ پتھریلا تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کانٹے دار جھاڑیوں سے بھی مزین تھا۔اس پر جب پتھروں کی ہیت گول ہونی لگی تو ان پر توازن برقرار رکھنا بھی محال ہو گیا اور ہماری رفتار بھی کم ہو گئی۔پھر اس

پر تو اتر سے بڑھتی بلندی نے بھی مشکلات پیدا کر دیں۔ ہمارا گائیڈ اس آرام سے ان پتھریلی راہوں پر گامزن تھا جیسے کسی نئی نویلی سڑک پر چہل قدمی فرما رہا ہو۔ عادت انسان کو کہیں کا بھی عادی بنا دیتی ہے۔ اَب ہم کالام سے کافی فاصلے پر آ گئے تھے۔ کچھ دیر سے بادلوں کے ٹکڑے کسی جلوس کی طرح اکٹھے ہو رہے تھے۔ پہلے انہوں نے سورج کی کرنوں کا راستہ روک کر دن میں رات کر دی اور پھر ایسا مچل کر گرجے اور برسے کہ آناً فاناً سب جل تھل ہو گیا۔ ہوٹل کی بالکونی میں گرما گرم چائے کا پیالہ ہاتھوں میں لئے اس مچلتی بارش کا لطف لینا تو قیامت لیکن تیر جیسے قطروں کے عین نشانے پر آ جانا، بس کیا کہوں۔ لمحے گزر رہے تھے کہ ہمارے لباسوں کے ہر دھاگے سے پانی کے چشمے بہہ نکلے۔ اس کو بھیگ جانا تو نہیں کہا جا سکتا، ہم تو اس پانی کی چادر میں غوطے کھانے لگے۔

جہاں نیلے آسمان میں سفید بدلیوں کی محفل سجی تھی وہاں اَب کالے سیاہ بادلوں کے جمگھٹے تھے جو تاک تاک کر بجلی گراتے اور صور پھونکتے۔ ہم نے گائیڈ سے پوچھا کہ جھیل کتنی دور ہے تو بولا دو راستے ہیں۔ ایک پہاڑ کے اوپر سے جاتا ہے جو ذرا لمبا ہے، چڑھائی بھی زیادہ ہے لیکن پگڈنڈی ہے اور چلنا آسان ہے۔ دوسرا راستہ بہت مختصر لیکن ذرا کٹھن ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ مختصر فاصلے کا انتخاب ہی کیا جائے اور دل میں سوچا کہ اس سے زیادہ اور کٹھن کیا ہوگا۔

گرتے، سنبھلتے چلتے رہے، یہاں تک کہ راستہ ایک چھوٹی پہاڑی نے بند کر

دیا۔ حیرت سے اپنے گائیڈ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ جب بارش کی چادر کے پار غور سے دیکھا تو ایک عجیب سا منظر نظر آیا۔ وہ پہاڑی بالکل چٹیل تھی ہاں اس پر کچھ خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ تیز بارش کی وجہ سے پانی کی ایک ندی اس کی ڈھلوان پر بہہ رہی تھی۔ وہ پہاڑی جہاں زمین سے ملتی تھی وہاں اس کے بطن سے جڑی ایک رخنہ نما لکیر تھی جسے کسی طور راستہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس پر بمشکل ایک پاؤں رکھنے کی جگہ ہوگی۔ لیکن سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ اس پل صراط اور نیچے بہتے ٹھاٹھیں مارتے دریائے سوات کے درمیان اور کچھ نہ تھا۔ یہ دریا اس طرح بن بلائے مہمانوں کو پتھروں سے پٹخ پٹخ کر مار دینے کے لیے بہت مشہور ہے۔ ہمیں اپنے گائیڈ کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا اور سب ہی بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اطمینان سے بولا کہ وہ تو ہر دوسرے دن وہاں سے ہی گزرتا تھا۔ اس نے ہماری ہمت بندھائی اور ہم سب بھی جوشِ جوانی کے جھانسے میں آ کر مان گئے۔ سب سے پہلے گائیڈ اس لکیر پر، یا راستہ کہہ لیجیے، پر چڑھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پہاڑی پر رکھ لئے اور گویا اس پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ اس کے پاؤں آدھے اس راستے پر اور آدھے ہوا میں معلق تھے۔ وہ پہلے ایک قدم آگے بڑھاتا اور پھر توازن صحیح ہوتے ہی دوسرا بھی اس کے ساتھ ملا لیتا۔ ایک دو دفعہ اس نے خودرو جھاڑیاں بھی پکڑیں لیکن چند ہی لمحوں میں وہ خیر خیریت سے دوسری جانب اتر گیا۔ فاصلہ کوئی سو میٹر ہوگا یا کچھ اس سے زیادہ۔ ہمارا پہلا نوجوان ہمت کر کے آگے بڑھا اور گائیڈ کی نقل اتارتے ہوئے ہولے ہولے قدموں سے دوسری جانب چلا گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا

بھی بخیر وخوبی پار ہوئے۔ اَب ہم تین رہ گئے تھے! میں، کاشف اور جمیل۔ ہم نے سوچا کہ اکٹھے ہی چلتے ہیں۔ جمیل پہلے، پھر میں اور آخر میں کاشف اس رستے پر گامزن ہوئے۔ سب ٹھیک جا رہا تھا کہ اچانک نہ چاہتے ہوئے بھی جمیل نے نیچے بہتے دریا پر نگاہ ڈالی اور سکتے میں آ گیا۔ وہ بس جہاں تھا وہیں جامد ہو گیا۔ نتیجتاً ہم دونوں بھی رک گئے۔ جب تک سفر جاری تھا ماحول کی نزاکت ڈھکی چھپی تھی۔ اَب جب حرکت رکی تو جانا کہ پانی کے مسلسل بہاؤ سے پہاڑی کا شرابور بدن پھسلن کی ایک نئی جہت کو دعوت دے رہا تھا۔ زیادہ تر خودرو جھاڑیاں بہت چھوٹی اور کمزور تھیں۔ خود کو سنبھالنے کے لیے ان پر تکیہ کرنا بے وقوفی تھی۔ پانی کے ساتھ ساتھ اَب گیلی مٹی بھی شامل ہو گئی تھی اور اس نے ہمارے پہلے سے ہی مختصر اور غیر کافی رستے کو اس قدر گیلا اور گندا کر دیا تھا کہ پیروں کا توازن برقرار رکھنا ناممکن ہو چلا تھا۔ اور پھر دور نیچے کہیں بہتا دریا جو گھات لگائے ہماری چیخوں کا منتظر تھا۔ بہت دہائیاں دیں ہم نے بھی اور دوسرے کنارے والوں نے بھی۔ بہت سمجھایا، بہت ڈانٹا، بہت ناراض ہوئے لیکن پتھر سے بنے جمیل کو کوئی اثر نہیں ہوا۔ کاشف نے چیخ کر مجھ سے کہا کہ آگے تو جا نہیں سکتے واپس ہی چلتے ہیں۔ میں نے بھی حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے فوراً حامی بھر لی۔ ہم نے انتہائی احتیاط سے قدم رکھتے واپسی کا سفر شروع کیا۔ پھر وہ ہوا جس کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ موسلا دھار بارش سے لینڈ سلائڈنگ شروع ہو گئی اور ایک ہولناک آواز کے ساتھ چھوٹے بڑے پتھروں کا طوفان ہماری طرف لپکا۔ اَب تو موت کا یقین ہی ہو گیا اور آوازیں سینوں میں ہی گھٹ کر رہ گئیں۔ خوش

قسمتی سے ہماری طرف صرف کنکریاں ہی آئیں اور چھوٹے چھوٹے زخم دیکر چلی گئیں۔ لیکن ایک بڑا سا پتھر کاشف کے قدموں سے کچھ فاصلے پر گرتے گرتے ہمارے راستے کا ایک حصہ بھی ساتھ ہی لے گیا۔ پتھروں کی بارش سے بچنے کے لیے جب ہاتھوں سے چہرے اور سر کے بچاؤ کی ترکیت کی تو پہاڑ کی سطح سے رابطہ کچھ لمحوں کو ٹوٹ گیا اور توازن بگڑ گیا۔ میں نے قریب ہی ایک جھاڑی پر ہاتھ ڈالا تو وہ میرے ہاتھ میں جھول گئی۔ بے بسی میں پوری طاقت سے اپنے لہراتے جسم کو دوبارہ پہاڑی کے سینے پر دے مارا۔ درد ہوا لیکن بھول گیا۔ اَب اوپر سے مٹی اور کنکریوں سے اٹا پانی کا ریلہ متواتر بہہ رہا تھا اور آنکھیں، منہ یا ناک کچھ بھی اس کے شر سے محفوظ نہ تھے۔ جمیل اَب بھی جامد کھڑا تھا۔ بالآخر میرے ہاتھ ایک مضبوط جھاڑی آ گئی تو توازن سنبھلا۔ میں نے اپنے بائیں جانب کاشف کی طرف دیکھا تو وہ بھی جھاڑی کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ نہ آگے جا سکتے تھے اور نہ پیچھے، اوپر ناراض آسمان، سامنے پتھریلی چٹان اور نیچے موت۔

ہم اس جھمیلے میں بھول گئے کہ ہمارے دوسرے کنارے پر موجود ساتھی ہماری مدد کا سامان کرنے میں لگے تھے۔ گائیڈ کسی طرح سے اس چھوٹی پہاڑی پر چڑھا اور عین جمیل کے اوپر نمودار ہوا۔ اس نے اپنے تھیلے سے رسی نکالی اور نیچے پھینک کر جمیل کو اس کا دوسرا سرا پکڑنے کو کہا۔ کچھ دیر لگی لیکن بالآخر جمیل نے رسی کو تھام لیا۔ گائیڈ نے اسے صرف اپنی طرف دیکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے آہستہ آہستہ راستے کے اختتام کی جانب چلنا شروع کیا، تو جمیل بھی رسی کو تھامے اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا۔

ہماری بھی ہمت بندھی اور سفر پھر سے شروع ہوا۔ میں نے جب بالآخر زمین پر قدم رکھا تو کچھ لمحے تو یقین نہیں آیا اور کچھ روہانسی ہنسی نکل گئی۔ کچھ ہی دیر میں کاشف بھی پاراتر آیا۔ اس کے بعد ہم نے جمیل کے ساتھ کیا کیا اس کا یہاں ذکر کرنا کچھ شائستہ نہ ہوگا۔

ہم اَب کیچڑ میں لتھڑے جھیل کی جانب بڑھنے لگے۔ چلتے چلتے بارش نے کیچڑ دھوڈالا اور دوبارہ زندگی ملنے سے دل میں ایک نئی امنگ نے جنم لیا۔ ہم کوئی دو گھنٹے اور چلے جس کے دوران بارش تھم گئی، بادل چھٹ گئے، سورج کی کرنیں زمین پر وارد ہوئیں تو ہر شے کے رنگ نکھر گئے۔ بالآخر ہم کنڈول جھیل پہنچ گئے۔ جب پہلی نظر پڑی تو سفر کی تمام صعوبتیں جیسے ہوا ہوگئیں۔ سبز گھاس سے ڈھکے اور بلند و بالا درختوں سے اٹے پہاڑوں کے عین بیچ نیلے پانی کا ایک جہان آباد تھا جو اپنے اردگرد پھیلی کائنات کے ہر رنگ کو منعکس کر رہا تھا۔ دل نے کہا کہ یہاں تو بدیع الجمال کا آنا لازم ٹھہرا۔ کون سی روح ہوگی جو اس منظر کی متلاشی نہ ہو۔ ایک میٹھے پانی کا پیالہ جو پہاڑوں کی گود میں ان کے رسیلے عرق کو سمیٹے، آرام کی چادر اوڑھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے سکون اور سکوت نے ہماری روح کو الحمدللہ کہنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی کچھ نہیں بولا، بس تکتا رہا، محسوس کرتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب حسن و جمال کا پیکر نظر آ جائے تو زبان نہیں چلتی، چھریاں چل جاتی ہیں۔ بے پرواہی آنکھوں میں ایسی چھاتی ہے کہ انگلیاں کٹ جاتی ہیں پر درد نہیں ہوتا۔ ہمارے گائیڈ نے اس سحر کو توڑا اور بولا کہ وہاں گزارنے کو ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے تھے۔ ہمیں واپس شام

ڈھلنے سے پہلے پہنچنا تھا۔سوات اور خاص طور پر کالام کے علاقے میں جنگل گھنے اور دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ان جنگلوں میں رات ڈھلے جنگلی حیات کا راج ہو جاتا ہے اور یہ جگہیں محفوظ نہیں رہتیں۔گائیڈ نے اپنے تھیلے سے ابلے ہوئے انڈے نکالے اور تین تین سب کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔انڈے گھریلو مرغیوں کے تھے جنہوں نے کبھی اسیری نہیں کاٹی تھی۔اس لیے کھاتے ہی بدن میں برق دوڑ گئی اور سردی کا احساس کم ہوا۔انڈے کھا کر جھیل کا ٹھنڈا پانی پیا تو ہر عضو جوان ہو گیا۔دل میں سوچا کہ سفر تمام ہوا۔اَب جی بھر کر اس منظر کو اپنی آنکھوں میں سمو لیں تا کہ خوبصورت خوابوں اور انمٹ یادوں کا کچھ سامان ہو۔لیکن گائیڈ کی ذنیل میں ابھی ایک اور کرشمہ ظہور پذیر ہونے کو تڑپ رہا تھا۔

جب سب ٹولیوں میں جھیل کا چکر لگا کر واپس ایک جگہ آن بیٹھے اور خوش گپیوں میں مشغول ہوئے تو گائیڈ نے اپنے تھیلے سے ایک بانسری نکالی۔جب اس کے لبوں سے نکلی سانس کی مستی بانسری کی دھن میں بدلی تو ماحول رومانوی ہو گیا۔نیلا آسمان،سورج کی ٹھنڈی میٹھی لو،ہوا کی یخ بستگی،پرسکوں نیلا پانی،خاموش سبز پہاڑ، صدیوں سے جامد پتھر،سات مسافر اور بانسری کی آواز۔خوابوں کی پوٹلی تو جیسے بھر سی گئی۔

وقت ہونے پر واپسی کا قصد کیا۔کافی دیر مڑ مڑ کر دور جاتی جھیل کو دیکھتے رہے اور وہ بھی ٹکٹکی باندھے ان چند لمحوں کے مہمانوں کو وداعی مسکان کے ساتھ الوداع

کہتی رہی۔ کچھ لمحے میں جب گائیڈ نے زیرلب مسکراتے ہوئے پوچھا کہ کون سا رستہ لیں تو سب کی ہنسی نکل گئی۔ جن پتھروں پے چل کر گئے تھے انہیں دل ہی دل میں الوداع کہا اور ایک دوسرے راستے کے پتھروں سے دل لگی کرتے شام کے دھندلکے گہرے ہونے سے پہلے کالام شہر میں داخل ہو گئے۔ مڑ کر دیکھا تو ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا، اس کے عقب میں سرسبز پہاڑ اور ان کے پیچھے دن بھر نور بکھیرنے کے بعد تھکا ماندہ گلابی سورج اور اس سورج کے عین نیچے کنڈول ڈنڈ جس کا شفاف پانی اَب شام کے دھندلکے اور سورج کی لالی منعکس کر رہا تھا۔